آفاقِ نوا



شفیق فاطمہ شعریٰ

ناشر، شالیمار پبلیکیشنز، حیدرآباد ۳۶ (اے پی)

سلسلہ مطبوعات

نمبر ۶۰

نام کتاب .... آفاقِ نوا

شاعرہ .... شفیق فاطمہ شعریٰ

زیر اہتمام .... تقیہ مہاجر

ناشر .... شالیمار پبلیکیشنز، حیدرآباد ۳۶ اے پی

طباعت .... نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد ۲

سرورق ڈیزائن .... قیصر سرمست

سرورق طباعت .... ندرتی آرٹ پرنٹنگ پریس، حیدرآباد

تعداد .... ایک ہزار

سنہ اشاعت .... دسمبر ۱۹۸۷ء

قیمت ۳۰/- روپے

(ملنے کے پتے)

★ شالیمار پبلیکیشنز - ۲۸۷ بی نیا ملک پیٹ، حیدرآباد ۳۶ اے پی

★ شفیق فاطمہ شعریٰ - ۲/۱۷ اے نیا ملک پیٹ، حیدرآباد ۳۶ اے پی

★ نیشنل بک ڈپو - چار مینار - حیدرآباد ۲

★ مکتبۂ جامعہ - دہلی - بمبئی - علی گڈھ

★ سید محمود خاور - ملیر سٹی - ملیر - کراچی پاکستان

اِنتسابْ

والدۂ مرحومہ
ظفرانساء بیگم کے نام

کن انجانے افقوں پر
تابندہ جبیں ہے
دھول بھرے آنگن کا وہ چاند
اک پُرسوز تبسم جس کا
میرے پاس امانت ہے

فہرس

پیش لفظ

سیارے گردش کرتے رہیں گے
ستاروں کے اطراف

اور ہم
اپنے ناموں اور سراپاؤں کے ساتھ
تیرے نام
اور تیرے سراپا کی
جھلک لکھتے رہیں گے

شبِ قدر کے آسمان سے
چھال چمڑے پر اُترے ہوئے حروف
یادداشت میں
طلوع و غروب کا کھیل کھیلتے رہے
جو لفظ ان کی درو بست سے بنا

اس کا مرکزی روشن نقطہ
اس کا سادہ سہج مفہوم تھا

فنا کا دھڑکا تھا
جس کی لگاتار ضرب
وجود کی روپ ریکھا تراشتی رہی
چاہت کی رُت میں
ارمان کی بے اختیاری کے آگے
بند باندھتا ہوا
فنا کا دھڑکا تھا
آتشِ دل کو مزید ہوا دینے والا
اُڑتے ہوئے وقت کے نشانات
کہیں ایک لمحہ کی شکل میں
کہیں برسوں اور صدیوں کے
پیچیدہ الجھاؤ کی صورت میں
انسان کی رفتار پر گواہی دیتے ہیں
شعور کی سطح پر
اپنا اثبات کرنا
جس کی ذمہ داری ہے

شاعر کا من

کسی ایسے دلیرانہ ۔ ڈھیٹ اقدام پر
للچا اُٹھتا ہے
جیسے کہ
گھاس پھوس اور پتوں سے ڈھکا گڑھا
اپنی پیش قدمی سے پاٹنا
یہاں تک کہ درختوں کے پیچھے سے
سدھائے ہوئے ہاتھیوں کے غول برآمد ہوئے
اب صدیوں تک ہم جو کچھ بھی لکھیں گے
وہ ایسا ہوگا
جیسے صدیوں سے زمینیں
بنجر پڑی ہیں

اختتام

کارہائے مابہ پایاں نارسیدہ
دردو داغِ آرزو، درماں نہ دیدہ

تصنیف ناظم شعری
۲۸/۱۲/۸۷ء

شہرِ نوا

جس گرد و نواح میں مہکی تھی
وہ نغمہ بہ لب لالے کی کلی
پتّی پر لپٹی پتّی سرکاتی
آہستہ خرام سنہری دھوپوں میں
اک پوری رُت کا خم اُس کے
اُمرت سے بھرا
ایک پوری رُت ڈنڈی ڈھلکانے
پنکھڑیاں بکھرانے کو درکار ہوئی
سب چمن چمن گل حوض لبالب، سائے گھنے
جھونکوں کی صورت کی، رواں دواں

اُفتادہ بظاہر سب راہیں
رہتی ہیں پیہم سرگرداں
سب اگلے پچھلے یُگ
سب بستے اُجڑتے گاؤں، نگر
شر نارتھی، نزواسی
پیہم دہراتے ہوئے
وہ بیتی باتیں
جن کا کوئی اَنت نہیں

پیڑھی پیڑھی کا لکھ پتی
ان راہوں پر
چلتے چلتے تلوے پتھرا جاتے ہیں
پتھراہٹ
دھیرے دھیرے ہستی کا ظاہر، باطن سب لیتی ہے نگل
آنکھیں ساکت
آنسو جم جاتے ہیں

جب کوئی نہ ہو
جب سایۂ شاخِ گل افعی بن کر ڈسنے لگے
ہر آہٹ کے نادیدہ ہاتھ میں چاقو کا پھل کھلا ہوا
رہ رہ کر چمک اٹھے

تب کون ہے یہ
شانے پر نرمی سے رکھا جانے والا
ایک ہاتھ .... کہیں یہ
خسرو کا نغمہ تو نہیں
اک پل سنجوگ زمانوں کا
جانوں کا اور ارمانوں کا
جھرنا بن کر پتھر سے پھوٹ پڑا
یہ اپنی آنکھیں
کتنے دور دراز زمانوں میں
کھل سکتی ہیں
پانی اس چھاؤں کا ٹھنڈا یخ
پانی میں بسی کوزہ کی سگندھ

مرہم زخمِ جگر کا
اور کاری اتنا
یہ اپنی آنکھیں کتنے دُور دراز
زمانوں میں کھُل سکتی ہیں
سب کچھ ویسا ہی جیسے سچ مچ کا
ذی نفس، کشادہ، گرد و پیش
تعمیریں اُجلی اُجلی

جادوں میں
ہر آن اُجاگر، اوجھل، ارض و سما
اس گرد و نواح میں اُترا تھا
اک شہر نوا
وہ ایک سمے کا دیپ، سمے کی آندھی میں
جلتا تھا یہاں
اس میں جتنا بھی شامل تھا

محلوں کا فصیلوں کا حصّہ
نابود ہوا
نابود ہوا جاتا ہے پیہم
قتلِ عام کا خطّ

لشکر گاہوں کا رقبہ
قرنوں کا اثاثہ
پورب کا آہنگ یہ جانا پہچانا
اک نرم تمازت، بسنت رت میں
رچی ہوئی

جب جب میں لالی لکھتی ہوں
اک سورج زیرِ خطِ اُفق
محجوب ہوا جاتا ہے جیسے اک عالم
ہو اُس کی طرف انگشت نما
تھم جاتے ہیں پل بھر کو تو اگر سفر نصیب
یہ کس ساگر کی پروردہ بدلی ہو گی
کتنی جاں لیوا مسافتیں طے کر کے اُسے
اس وادی کے دامن میں ملا
ہنگام...... برسنے کا

شجرِ تمثال

مٹی اچھوتی

اس میں گندھی ہے

بدلی سلونی اور رات کالی

حبس بھی ہے کس بھی

اس کی تہوں میں

فولاد کا زور پھولوں کا رس بھی

جوشِ نمو میں شق جا بجا سے

باڑھیں منڈیریں ناپید

شیلے حدِ اُفق تک

پگھلے سونے کی لہریں سنہری

یہ گھاس بن ہے یا دھوپ کا سیل

گھل مل گئے ہیں اس میں ہمارے بہتے نفس بھی

یہ بھاگ والی مٹی !

ابھی تک

اس کا اُگم ہے سورج کی لالی

تتلی کی پرواز

وحشی ہوا کے ریلے میں خود پر قابو نہ پائے

بہتی چلی جائے

بے سمت بے سُود

تب اک سنہرا ننھا سا بُوٹا

اُبھرے پکارے

اس سے اُلجھ کر کچھ دیر کا بنیں بکھرے ہوئے پر

پھر شانت ہو جائیں

کتنا غنیمت نازک سہارا

اتنی سی اک بات

اور اس پہ دیکھو

ٹیلوں سے آفاق تک گھاس بن میں

دھیمی سی شورش لرزہ جگائے

پار بنیوں کو برگد کی تھامے

بُت بن گئے ہم

اس کی جڑیں ہیں گہری زمیں میں

یہ اصلیت ہے

ہم ایک سپنا

سوچوں سے اُبھرے سوچوں میں ڈوبے

ہم اوس کی بوند

اک پنکھڑی پر نگ بن کے روشن

زرفام کرنیں

دیکھیں تو چونکیں

راہو یہ آرام (!)

زرفام کرنیں

چن چن کے ہم کو

برنا سویروں کے آنچلوں میں

ٹانکیں سجائیں

جتنے ہوئے دور

اتنے ہوئے نور

حد فاصلوں کی بڑھتی ہی جائے

کتنا یہ اچھا ہے

بسرا نہ پائیں

پر بھول جائیں

اک پنکھڑی پر رنگ بن کے روشن رہنے کے سکھ کو

کس زور کس شور سے بہہ رہا ہے
بے سُدھ کنارا

اس میں تو ہر شئے
سیّال بے حال
سمتوں کا اُلجھاؤ

امڈا ہوا کف

رشتوں کا پھیلاؤ
اُڑتا ہوا جھاگ
بڑھتی ہوئی رَو
چڑھتی ہوئی رَو
دریا سے ساگر
ساگر سے ساگر
(یہ بات کیا تھی ؟)

اگلا کنارا
پچھلا کنارا
غرقاب سب کچھ
یہ بات کیا تھی

کیا اس میں سکھ ہے
بے چین جاں کا ؟

دل ایک دھیمے دُکھ کا جوالا
سلگے پکارے
ہم بھی عجب ہیں
دوری میں کامل
بسرا دے کی دھند میں ٹمٹماتے
بے نام تارے

ہم بھی عجب ہاں
پرواز شعلہ
پھونکے سدا کو بچھلا نشیمن
رفتار ــــ
اندھا دھند، اپنی ہی رفتار
یوں راہ مارے "

اک جل پری سی آئینہ رُو لہر
خود میری آواز
گاتی رہی "جل دھونی ہے دھونی

صندل تھے بھولے بسرے کنارے
ہیزم ہے سب کچھ
شاخوں شگوفوں پھولوں کے زینے
خوشبوؤں کے بام
گم گشتہ سطحیں
ان گھڑ چٹانیں
جو ان سے اوپر اُٹھ جائیں
وہ سُت!

وہ بُت، وہ اصنام"
گاتی رہی: "تم ہیزم میں شعلہ"
میں نے کہا پھر
تیرا ثمر کیا؟
کالا دھنواں؟

یا — سونا فیتلا؟
یہ بات کیا تھی
کیا اس میں سکھ ہے
بے چین جاں کا؟

اُڑتی ہوئی راکھ،

سونا فتیلا

— باتوں کے پیچاک
اور آس دل کی
اک کلمۂ پاک

اس کی جڑیں ہیں گہری زمیں میں
شاخوں کا چھتنار آکاش میں گم
ہر رُت کے جھونکے میں نو شگفتہ
سرسبز خوشبو

گھلتی چلی جائے
صاحب نوا کے لہجہ میں آباد
معصوم ارمان ان ہونیوں کا
دھانی بسنتی اطراف و اکناف میں
ہیں بکھیرے

یہ خوش اساسی
امڈا اسی سے
بالیدگی کا امڈاؤ —

لیے اننت ناحی تسلسل
گونگا نندا سا دھندلا سا اک کُل
جب تک نہ کھوجے

یہ دوارا اپنی سونی کٹی کا
اک ذات ـــــ آغاز اور منتہا
اک پورا سراپا
تب تک نہ ابھرے آواز
تب تک
آواز کی گونج واپس نہ آئے
ہر فاصلے کے تپتے جگ میں
تب تک نہ جاگے وہ سطحِ شیریں
جو اک نفس کی پورب دِشا میں
دوجے نفس کی مہندی رچائے

کھیل رُتوں کا

اک رُت آئے اک جائے
ہم رُت رُت چونکیں
کروٹ بدلیں سو جائیں

معصوم گلاب پھواریں
بے لفظ تحیّر
بادل چمکیلے سفینے
میداں ٹھہرا ہوا پانی
سائے وہ جزیرے دھانی
اُجلی شادابی آنکھیں
بھونرا تو ہنسی فوارہ
پھر دھول دھوئیں کا پردہ

آنا جانا چونکا
اک کھیل رُتوں کا
اپنی نظروں سے اُوجھل
اک سیارہ دل اپنا
انجانے گہر میں ڈوبا
عُمریاں پونم کا
شفاف رقیق اُجالا
وہ گُھلتے پگھلتے کھنڈر
وہ سناٹا اُس میں پگھلتا
دیکھا تو قلم بھی اپنا
اک دن پگھلا پگھلا تھا

شعری شعری شاید اک
طائر تھا جو چہکارا

دھندلے دُھندلے غاروں میں
وہ گھومتے پھرتے رستے
آواز کے لہرے کو پھر

باہر لے آئے
تپتے سورج کے نیچے

سورج کے نیچے جھرنا
ہمہمہ نہ تھمنے والا
روشن پانی کا

بوچھار کا شور ہوا میں
اُڑتی ہوئی جگ مگ ٹھنڈی
سیمابی چھلکی چھلکی
سورج کے نیچے جھرنا
کرنوں کے لئے آئینہ

پتھر کے سراپا
ان کی
پتھر خاموشی
اک چکنا چُور چھنا کا
شیشے کا ظرف تھا کوئی

کافر! کافر! سرگوشی

برھم سرگرم ہوا کی
کافر! کافر! وہ گچھے
پھولوں کے، پھلوں کے خزانے
اُونچی شاخوں سے جھکائے
کس نے ؟
کیا تنہا تم نے ؟

کافر! کافر سرگوشی
باتیں اور کتنی باتیں
جاری تھیں کتنے موسم
بدلے کتنی تقدیریں
تحریریں ان کے ابھرنے
مٹنے میں اپنا اُبھرنا
مٹنا
مٹتے مٹتے بھی
"ہم" فائق سب سے، کہنا
کہہ کر کِھل اٹھنا
اب اک سپنا لگتا ہے

رُت کا جل پگھلا پگھلا

رُت گہرا جل بسرا دا
اک خاک بسر آنگن سے
اُگتا ہوا تارا نغمہ
جینے کا جواز ہے کس کا
اپنا نہیں پھر بھی کتنا
اپنا لگتا ہے
اس پر سر دھنتے دھنتے
مٹ جائے یاد نہ آئے
پیرایہ مادشما کا
یہ کونسی رُت ہے
کس سے
پُوچھیں
کیا نام ہے اس کا۔

لبِ کُشا

یہ چُپ کتنے دن کی تھی جو آنسوؤں میں ڈھلی
یہ گھڑی، چٹان ایسی پتھریلی جامد انوکھی سی چُپ
اس کو چھُونا بھی ممکن تھا تب
یہ چُپ تھی کہ پورا وجود اپنا جو آنسوؤں میں ڈھلا
بتاؤ تو اس چُپ کی بھیدوں بھری تھاہ میں شور کیا تھا
بتاؤ تو کیا گونج تھی
ایک صدا دوسری سے ہم آہنگ جس میں نہ تھی
جیسے صدیوں کی بے خواب دھندلی شبیہیں
دُھواں دَھار جلتی چتاؤں میں گھِر کر تڑختی اچھلتی ہوں
کہتی ہوں تقدیر برحق ہے، برحق ہے۔ زندہ اٹل
ہم آہنگ گردش ستاروں کی ہے

پیڑ گئیں جو فضاؤں میں لیکیں پرانی
وہ ان پہ پھرے جا رہے ہیں، پھرے جا رہے
سب حدیں ان کی بیہودہ ہیں
مگر اپنے خواب و حقائق کا سیل عظیم
کوئی لیک اس کی بنا دے
مگر ــــ کیوں؟
کبھی جو بنا دے بھی کوئی تو سوچو
ہمارے قدم اور لیکوں کا رشتہ کہاں تک
کہ اک حد پر مٹ جائیں گی وہ
تو کیا ہم بھی تھم جائیں گے......!
ہم تو بڑھتے ہی رہتے ہیں
چاہے وہ زلزال ہو جو ہمکتا نظر آئے
چاہے اک سوچ ہو جو تراشے چلی جائے بے شور و شیون
سیہ دہشتوں کے پہاڑ

سزاوار رفتار ہم
اور ہر اک گام پر پائمالی وہ اپنی ہو یا دوسروں کی
تاسف نہیں اور سوگ میں ایک جیسی ہے اپنے لئے

سفینہ تھا بھاری تو کیا کیا نہ کچھ پھینک ڈالا
مژہ سے ٹپکتے ہوئے قطرۂ اشک کا بار
خوابوں سے خوشبو کا بوجھ
نچوڑا تو لہریں بھی ہلکی گلابی ہوئیں
رُندھی لے میں گاتی رہیں، دل دکھاتی رہیں
کوئی ہم سے پوچھے
کہ اب وقت کیا ہے؟
تو ہم کہہ اٹھیں "اک صدا"
ہم اس میں کچھ ایسے کھو گئے
اب صدا پر بھی تعزیر کیسی

صدا در ـــــ
کہ اک لب کی پیاس اپنے گلو میں جلائے
کھڑی ہے ستم کش تمنّا کنارِ فرات

٭ ٭ ٭

ارضِ موعود

وعدے کی زمیں نہیں آئی
وہ اُونچا شکھر جو سب نظروں میں گھرا ہوا ہے
بے پروا، معصوم، اٹل
وہ گہرا ساگر جس کی تھاہ میں
اپنے سوا کوئی نہیں
وعدے کی زمیں نہیں آئی
نومیدی بکھرا دے نہ کہیں
بے تابی جھلسا دے نہ کہیں

کھو جائے نہ خود ہی کھوج کا گھائل پنچھی
اڑان کے ساتھ اندھیاری گھاٹی میں
ہم ہیں تو یہی غنیمت ہے
ہم ہیں تو زندہ ہے وعدوں کا اگم
موجوں کے بعد ابلتی موجوں کا دھارا
جو فراموشی کے ریگستاں میں بہتا ہے
اس کی راہیں پہلے ہی سے مقرر ہیں
اور ان سے ہٹ کر کوئی راہ نہیں
سنگین سچ کی پتھریلی زمینوں میں
ارمانوں کا ذرّیں کہرا بکھراتا
سچ کے سوتوں سے پھوٹتا رنگین جھوٹ
سچ کا ساگر کھوجتا، شیریں جھوٹ
البیلے نڈر سپنوں کا بہتا گاتا جل
اس موڑ پہ اپنی منزل سے بھی فزوں تر ہے
پھر اپنا دوش ہی کیا
ایفا کے سورج کبھی پگھل جاتے ہیں
وعدوں کی لالی میں گھل مل جاتے ہیں
ہنگام طلوع و غروب سے دور
دن بڑھتا ہے نہ رات گذرتی ہے

بہتے ہیں آجالے شوخ رسیلے
اور مدماتے دھندلکے جیسے بسنت
وعدے اَن گنت کِھلا کرتے ہیں پھولوں میں
چمکا کرتے ہیں ستاروں میں
دھڑکنوں میں سانسوں میں
اک سماں سُہانا چھایا رہتا ہے
دھرتی سے آکاش کے بیچ
دل سے آنکھوں تک
— ازل ابد کی وسعت میں

٭٭ ٭٭

رُت مالا

نیلے بھورے پربت تجھ پر
برکھا موسم موسلم برسی
تجھ کو بہا نہیں پائی
آندھی ٹکرائی پر اڑا نہیں پائی
دھوپیں پگھلانے کو بڑھیں
تب بدلی چھتر بنی
تب شیتل شام آئی
نیلے بھورے پربت

ہم تب بھی آزاد تھے
اب بھی ہم آزاد رہیں دل شاد رہیں
پابندی گر ہو تو ایک ادا ہو
اپنی ہی من مانی ادا
ہٹی ضدی سدا رہیں

بربادرہیں تو بربادی اک پنچھی
ہم صیاد رہیں
ہم تب بھی آزاد تھے

ہم پاکھنڈی جنم جنم بہتے تھے جیسے تیز ہوا
جو کچھ اپنی راہ میں آیا ہم نے اس کو ساتھ لیا
ہم نے سوچا تھم جائیں گے تھام کے تم کو
تھام کے تم کو اونچی ٹہنی سے توڑیں گے گلاب
تب تک ہم نے سوچا تیزی روی کا
ہر ارمان ہو پورا
تیز روی کی لاج رہے
ہم پاکھنڈی ......

دھندلیں ڈوبے بھیگے جنگل راز بھرے آواز بھرے
دام بچھاتے ہیں گنجان درختوں کے
مکتی مکتی !
نہیں نہیں — یہ نرم ہوا
اس میں گھلا ملا ہے انساں اور خدا کا دل

نرم ہوا آنکھوں کو بند کیئے دیتی ہے بلے راحت سے
اور ستارے نیلمبر کے کتنے روشن ہیں
مکتی مکتی !

نہیں نہیں — یہ نرم ہوا

دُور کہیں تاریک ڈھلانوں میں جادوگر زہر پکاتے
کالی پرانی دیگوں میں
سبھی ایسے کانٹوں والی ڈھانچہ ڈھانچہ شبہیں
غاروں میں جنبش کرتی
ان کے آگے چلتی نیلی پیلی آگ
دیکھ کے جس کو ہم دہشت میں پڑے
ہم بگتی آنکھیں بھی ہم اڑتی نگاہیں بھی
ہم سب سے گہری تھاہ
سبھی افقوں سے پرے کا افق
ہم سب شکھروں سے اونچا شکھر
دہشت میں پڑے
دور کہیں تاریک ڈھلانوں میں

اور سدا کی
پگھلے پگھلے گلابوں کا جل چھلکاتی
بسرادے کی نرمل جوٹ سے شیر سی
چمکیلی دھارا بہتی ہی رہی
سُن سُن سُن سب نرک بجھے
سب کھاد بنے
اور سنہری دھانی نقطوں والی دھرتی ابھری
پاٹ گئی تاریک ڈھلانوں کو
سارے نشیب ہیں قد آدم
اونچے بنفشوں میں ڈوبے
بسرادے کی نرمل جوٹ سے شیر سی چمکیلی دھارا
بہتی ہی رہی

اور بہار آئی
وہ شیریں کچا میٹھا رس
جو اس دھانی نازک بیل سے ہم نے پایا
اپنے خم میں اس کے جوش کو دیکھ کے
ہم حیرت میں ڈوب لے

۳۸

تازہ گلوں کا شہد لبوں سے لہجوں سے
آنکھوں سے چھلکا
اور بہار آئی

بازگشت

نغمہ زارِ درد کی جانب چلے ہم
ایک بھی ذرّہ نہ کچلا جائے اس رفتار سے
نغمہ زارِ درد کی جانب چلے ہم
کنج میں پیڑوں کے سورج جھانکتا تھا
کوہساروں سبزہ زاروں میں جھمکتی روشنی کا جشن تھا
جشن جاری ہی رہے گا تا ابد
جاری رہے
نغمہ زارِ درد کی جانب چلے ہم
لعل و مرمر سے گندھا قالب

اور اُس کے ماورا اس کے قریب
بجلیوں جیسا مصفّٰی اک وجود
چار سو بکھرے ہوئے خاموش سونے آسماں

ہم کہاں ہیں ہم کہاں ۔ نغمہ زارِ درد ہے یہ (ہم کہاں)
اتنا بے آواز جیسے
آ تُما اپنی شعاعیں
ریشے ریشے سے بدن کے کھینچ لے
آہستگی سے بے گزند

اور دُوری بے فغاں ہو جسم کی اور رُوح کی
کیا سُبک رفتار کر دیتی ہے ہم کو بے دلی بے حاصلی
جیسے اک بادل کا ٹکڑا
اپنی چھاگل پھینک دے اُونچی فضاء میں
پیاسے ذرّوں کی طرف
پھر ہلکے پھلکے پنکھ پھیلائے اڑے

ہلکورے لے
اک مٹّی بنتی رنگ کی تحریر سی
سیراب ذرّے اس کو دیکھیں
اور پُکار اٹھیں
وہ کافوری سا شعلہ عظمتِ نارس !

دوام درد ہے وہ سرخ نرمل روشنی
(لو سانس کے سرچشمے سوکھے ہر شکایت مٹ گئی)
کیا شکایت سانس کے سرچشمے سے ان کو رہی
جو سانس لیتے ہیں یہاں؟
موج بے ہنگام خندہ
کیسے پھوٹی میرے لب سے
کوئی شکتی ہم میں ہے؟
جو یوں ہمیں پامال پا کر ہنس سکے!
یہ ہمیں آغاز ہی سے ختم کرنے پر تلی تھی
چاہے پھر خود ہی مجادر بن سکے انجام کار
احتجاج اس کا جو اک شکتی ہے مجھ میں
کس قدر پُر شور ہے
کس قدر پُر زور ہے
نغمہ زار درد سے آگے لئے جاتا ہے مجھکو
ان فضاؤں میں جہاں
بازگشت اک گیت بن جاتی ہے اس کی
جیسے سب ٹیلے چٹانیں اور کہستان
سانس کے چشمے میں شامل ہیں
دھڑکتے ذی نفس اور ہم نوا

شب نامہ

یہ ابرپارروں، ستاروں کا سائباں دھندلا
سراغ رحمت کامل یہ اونگھتا پہرا
نظر وراں! یہ بتاؤ نظر سے کیا پایا!
کرن سی یہ کہ جو کرتی ہے آر پار نفوذ
سکوت فاصلۂ بے کنار توڑے بغیر
خلا نورد ہم آہنگیوں کا اُلجھاوا
ہنر جو اس کو بنایا ہنر سے کیا پایا

وہی تحیرّ بے مدعا ، وہی دوری
پکارتی ہوئی پیہم قبولیت کی گھڑی
جو مل گئی بھی تو کچھ مانگنے کا پیرایہ
کہاں سے لاتے اسی دن کو دھیان میں رکھ کر
ریاض و مشق سے کچھ مانگنے کی عادت کو
جو بارہ بارہ برس پختہ کرتے رہتے تھے
ہمارے پرکھے ، وہ بھکشو غضب کے دانا تھے

تو پھر چلو کہ نظر اور نظاروں کے مابین
حجاب جتنے بھی ہیں شان بے نیازی کے
انہیں اٹھاتے ہوئے جان کی اماں مانگیں ،

تو پھر چلو کہ ابھی وقت ہے ، اندھیرا ہے
نشیمنوں میں شکر خوابیوں کے عالم کو

صدا لگاتے ہوئے دیکھتے دکھاتے چلیں
ملے درِ دل درد آشنا تو دستک دیں
وگرنہ فاصلہ رکھ کر سوال دُھرائیں

بلند بام سماعت سوال سُننے سے
نہ سیر ہو، نہ پسیجے، نہ اشتعال میں آئے
یہ تاڑ بن، یہ بلندی کا ٹیڑھا میڑھا طلسم
یہ جھنڈ جھنڈ تنے اپنی چھتریاں تانے
خود اپنے اوج زبوں کے خطوط کج مج پر
کبھی قبیلے کے غم، تاسنے حلیفوں نے
خفیف چھاؤں طلب کی تو بے دریغ ملی
نصیب غیر نہ کچھ تاسنا نہ کچھ پانا
ہر ایک گھونٹ جو ہو کر اکشیدہ بہ ریگ
نصیب غیر ہو یارب، نصیب خویش مزے

نئی نئی کسی اُفتاد جیسا یہ منظر!

چھپا کے رکھ دے جو نسلوں کے بعد نسلوں کو
بہت دنوں سے یہ جاری عجیب صورتِ حال
سرشتِ کہنہ کا، اپنی ہی منتہا تو نہیں
سوال اک ان سے جو اونچا سنیں، ضرور کریں
جواب بھی یہ اشاراتِ رائگاں مانگیں

ہوا کے شور سے بیدار ہو کے دل کی الاپ
ہوا کے شور میں پھر گم سی ناشنیدہ سی
چٹانوں تک بھی پہنچتی تو بازگشت کی گونج
کبھی تو ملتی —— انھیں منقطع وسیلوں میں
کوئی ہنکارا، کوئی عکسِ منتشر سرِ موج
کسی بھی موڑ پہ درماندہ کھوج کی خاطر
گر پڑا کوئی موتی شکستہ مالا کا،
ملے ملے نہ ملے پھر بھی ڈھونڈنا ہے ضرور

اکیلے پن کی بکھرتی ہوئی نمود جسے

دردمند دل کی لَویں
جگمگاتے نور نور
ثناگری نگاہ نغمہ در پہ
قرض تھی سو قرض ہی رہی

وہ کجکلاہ دلبری کی اک ادا سہی
کہ جھک گئی جبیں
ذرا سی بات تھی جسے بڑھا دیا ہمارے پیار نے

ہزار ہا دلوں پہ ایک کیفیت سی
جیسے موم کے مجسموں میں ہر برق کی
گذر گئی
علم جھکا؟
نہیں نہیں
کہ آفتاب جلسہ گاہ حشر و نشر کے قریب پھٹ پڑا

نہیں نہیں
گمانِ بد
نشانِ بد انتہاہ پیار کا
اٹوٹ قول کا قرار کا نشانِ بد
گمانِ بد، گمانِ بد سے ماورا
گہر بہ چشم عفو کار دلنواز خامشی

....

نواحِ جامعہ!
چراغِ درگذر، بجھا ہوا وہ
پھر جلا ـــ کہ شام ہو چکی
....



شفیع الاُمم

مرے دل میں کیا ہے
وہاں سروقامت چٹانیں کھڑی ہیں ابھی تک
جگر تاب دوپہر میں
وہاں آئینہ ان کے شایانِ شاں ہے تو سورج
وہ شاہد ہے اُن کا
وہی جانتا ہے مرے دل میں کیا ہے

وہاں ان چٹانوں کا سایہ بھی باقی نہیں ہے

جہاں وہ چٹانیں کھڑی ہیں ابھی تک
ہیولے وہ پس ماندہ اُن کے عزائم ہیں شاید
جو یُوں چاہتے تھے
کہ گڑھ بن سکیں
پُشت ہا پُشت کی زخم خوردہ انا کا

ہر اک ضرب جس نے نچوڑی ہے آہن دلوں سے کراہ
مری رُوح کے شور و شیون میں پتھرا گئی
جھپٹتی رہی اپنے خوں ریز جتھوں کے ساتھ
قضا، مضمحل قافلوں پر سدا
وہ بن مانس کے ہر نوٹے جب بھی گھرے
اِن سیہ فام غرّاہٹوں میں
تو پھر خوں چکاں مرگ آشام اک کھیل
تا دیر جاری رہا
نہ پتھریلے کھڈ میں اُتر کر لرزنا

نہ چھپنا دبکنا گھنی جھاڑیوں میں کوئی کام آیا

وہ شاہی کا زریں بگولا
جو پھرتا رہا بحر و بر خشک و تر کے پرخچے اڑاتا
اسی کے تو زرتاب ذرے ہو تم
تم نے سوچا یہ اکثر
مگر تم نے سوچا نہیں
تب بھی تم صرف پیادے تھے
تب بھی
کوئی اور تھے شاہزادے
غریبی میں پالا تمہیں ماؤں نے
پھر زمانے کی گردش ہوئی تم پہ جاری
رگوں میں لہو بن کے جو دوڑتی تھی
وہ بس دودھ کی لاج تھی
اور نادار پرکھوں کی پونجی دیانت
رگوں میں لہو بن کے جو دوڑتی تھی
اسی سے تو پارس بنی دھول ان کی سنا

خاک میں اٹ کے کندن سا چمکا سراپا

بلوطوں کا بن

زو میں وزنی کلہاڑوں کی آتا رہا بار بار

اور تنے جیسے اُفتادہ مینارِ آہن

پڑے تھے ہر اک ذمہ داری سے بے فکر

کتنے دنوں تک انہیں اُن کی جا سے

ہلا نے نہ پایا کوئی

وہیں دُور و نزدیک ننھے بلوطوں نے سیکھا جھجکنا

بُلندی کے انجام کو دیکھ کر بھی

بُلندی کی جانب لپکنا

نہ نسیاں میں کوئی مداوا

نہ آنکھوں میں گھُلتی ہوئی نیند

پیرایۂ رحمتِ رب

اب اس دُور اُفتادہ رقبے میں
نیلا ہیٹ آسماں کی
جو واحد شناسا ہیں
گونگے دلاسے کو اپنے زباں بخش بھی دیں
تو کیا کہہ سکیں گی

وہاں ایک زنبور نے باڑھ کے پار منڈلا کے دیکھا
تو رس اس نے کچھ بھی نہ پایا
اس نے مجھے لوٹ کر یہ بتایا
وہ اپنی ہی مانند ہیں ہُو بہُو
فرق بس ہے تو اتنا
کہ تھے جو بہت خوبرو
منکرِ آئینہ بن چکے

کبھی یُوں بھی تھا جب
ذرا جھک کے کچّے گھروں سے نکلتے تھے باہر

وہ ہنس مکھ سویرے وہ شاداب نصف النہار
تو سرسبز پگڈنڈیاں دھوپ میں ڈوب جائیں

ادھڑتے ہوئے پیرہن سے
جھلکتے ہیں تانبے کے شانے
تو اُن کی دُکھن چیخ چیخ اُٹھتی ہے
"یادداشت !
صلیبوں میں اے سب سے بھاری صلیب !
کہیں اس سے بہتر یہ ہوتا
کہ خم شہ رگوں کے وہیں کھول دیتے
اگر وقت نوروز بنتا ہمارے لئے
تو اقوام عالم کی ہوتی یہ باری
کہ ڈھوئیں سدا کو عذاب حیات

اگر جنسِ بازار ہوتیں مرادیں

تو جاں کے عوض مول لیتے
مگر کب شکستِ عزائم سے ہوتی
چکا چوند عرفانِ حق کی
جو صد سالہ شب زندہ داری سے ممکن نہیں
بہت یوں تو دانا تھیں بینا تھیں آنکھیں
بہت یوں تو دانا تھیں بینا تھیں
دارا تھیں گیرا تھیں آنکھیں
سکوں کی گھنی چھاؤں تھیں دردمندی کا دریا تھیں
صدق و صفا کا ذخیرہ تھیں آنکھیں
مگر یہ پہاڑی کے دامن میں پتھریلے کنڈ
نہ جانیں اُبلنا مچلنا نہ شورش میں ڈھلنا
تحمل کی شاموں میں گہرائیاں
اور گہری ہوئیں اور گہری
کبھی ہلکی ہلکی گلابی سنہری
کبھی ارغوانی الاؤ
چکا چوند عرفانِ حق کی

"یہ سچ ہے کہ پچھلے برس میں نے

تو نہ پھیلا ہوا تھا
یہ سچ ہے کہ اس سطح برتر سے
جس پہ ہوں میں ایستادہ
نشیبی کناروں کی جانب رہا ہے بہاؤ
مگر یہ ترے کیف وکم سے فزوں تر
مرا کیف وکم
اسے بھی جو جھٹلا سکے اب تو جھٹلا

اچانک نشیبی کناروں کی سمت ایک جست سیاہ
کچلیوں میں دبے نرخرے سے ابلتی ہوئی سرخ آہ
اور پھر کچھ چبائے ہوئے استخواں
آخری یادگار

سدا بھیڑیے نے اسی لہجہ میں بات کی
یہاں تک کہ اک دن نشیبی کناروں کی حد میں وہ آیا
تو حیرت سے دیکھا کہ ننھا سا اک میمنہ
کانپتا تھرتھراتا وہ ہے خود بدولت
کبھی میمنے کو بھی قسمت نے اک سطح برتر نے
خنجر صفت ناخنوں سے نوازا
بدلتے ہوئے موقعوں کا سیہ روز پہیہ
رہا گھومتا کور و کر بے ضمیر

بلا زن و طفل و برنا و پیر
ہجوموں کو روندے گیا
اٹھی، مرحمت رو لئے ایک اشکوں سے بوجھل گھٹا
اور لاوا اگلتی زمینوں پہ اک دم بخود سائباں بن گئی
سکوت اس کا با دیدۂ نم پکارے
نہیں عدل عدل !

ہزاروں دلوں میں دبی ہوک
زلزال کا روپ دھالے
ہزاروں بریدہ زبانوں کی کیفیتِ بے زبانی
کیئے جائے پیہم اشارے " نہیں عدل عدل!

اُجالا ہزار آنکھوں والا
گراں بارِ اجرام کی باگ تھامے
دلِ ذرّۂ بے نوا کا جراحت شناس

اک تحکم تاسف سے عاری
فنا کار پاداش گیر
ایک فرماں، اٹل، ہستی و نیستی کی اساس
اک منادی ندا جس کی ہے القصاص القصاص

پھر پہل سنگ باری کی کرنے
بڑھے کون پاک آستیں سب سے آگے؟
خموشی — ؟
خموشی نہیں — !
چشم پوشی یہ بازی نہ ہارے!
مشینوں کے مدِ مقابل مشینیں۔
درندے جراثیم عفریت — حشرات کی نسلِ نو
یا فنا یا عدم ہم — ؟
کہ پھر ہم ہیں وہ جو من و تو سے ہٹ کر ہے
دارائے ہست
ہمیں ہیں ہماری نمودِ دگر صبح تاریخ روشن ہوئی
ہمیں ہیں ہماری نئی آفرینش

کوئی دوست اس کا نہ بھائی پتا مہ، نہ شاگرد و اُستاد
موج در موج دریا روانی سے آباد
میں نے کہا کون ہوگا وہ دامِ علائق سے آزاد
دل نے کہا، شہریِ شہرِ امکاں
وہ ناوک فگن
تیر جس کی کماں کا ہٹیلا
کبھی مانگ بیٹھے جو خونِ جگر اس کا اپنا
تو وہ سمت جو اس کی ہستی ہے
اس کا نشانہ ہو
اس کا ہدف لعلِ ناب —
اسی سمت کا خون روشن
ہم آہنگِ آئینِ گلشن
اسی سمت کا خون روشن نگارندۂ روزگار
رن آنگن کے پہلے سویرے کی لالی
اسی سمت سے آشکار
اسی سمت کو کھو کے دھارے نے رفتار کھودی
تبھی سے پراگندہ قطروں کو
پامال سبزے پہ
شبنم نصیبی ملی

یہ بھول بھل میں ڈوبے ہوئے شہر، قریے
کبھی ان پہ رم جھم نہ برسی ہماری پکار
کبھی ایک انگشتری ایسی ہوتی
نگیں اس میں ایسا
کہ تابع ہو جس کے کوئی جن
کہانی کے الفاظ جیسا
تو پھر اس پرانے جوالامکھی کے احاطے میں آباد
پیارے مقاموں کو شہپر لگاتے
قریبی سمندر میں
بہتے جزیرے بساتے
گھڑی ڈوبنے کی جو آتی
خوشی سے قریبی سمندر میں ہم ڈوب جاتے

پھر وہ پھنکار اٹھی
دور میلوں مسافت پہ لہراتی ناگن سیاہ

آج مدّت کی پتھر خموشی بھی بن کے پانی
تو یہ فیض ہے کس کی گردِ قدم کا
"تمہیں میں کچھ ایسے بھی ہوں گے

کہ جو پا بہ زنجیر
لیجائے جائیں گے سوئے بہشت"

کسی بھی بہلنے

دوبارہ نظارہ
انہیں بھولی بسری فضاؤں کے
کچھ جانے پہچانے مانوس عکس
دیر تک کانپے آنکھوں کے خوننابوں میں
یہ ان ہونی ممکن ہوئی بھی

تو اس ذوفنونی کے ساتھ
پیش قدمی کے خطوں سے
پسپائی کے منطقوں سے بہت دور
بکھرا ہوا ہے کئی صدیوں کا ساز و ساماں ــــ
ورثہ دورِ محکومی و شاطری
کتنا بے اشک رونا

ہمارا تمہارا سبھی کا ــــ
ایک جگر خوار تکرار ــــ غدّار غدّار ــــ

دوش و فردا فراموشی کاری کے اوراق خستہ میں لپٹے ہوئے
لحن و اصوات
صحرا کی راہوں میں بے اوٹ شمعیں سحر دم
بھٹکتی ہوئی راکھ پروانوں کی دور دور

اور اس پار ــــ
کتنے کہستاں درے وادیاں ریگ زار
اپنے دامن کے پالے شگوفوں کو
بے انت بن باس پر بھیج کر
دھندلی آنکھوں سے تکتے سوئے رہگذار
شورِ ناقوس خوں در گلو
اور ندیوں کے تٹ ایک گم سم پکار
ہزاروں برس درشنوں کا سویرا
ہزاروں برس کی شبِ انتظار!

گجردم کے گاڑھے کہر میں سرنگیں بناتی ہوئی
چیخ انجن کی بڑھتی گئی
نیم خوابیدہ آنکھوں پہ ٹھنڈے چھپا کے لگاتی رہی

یخ ہوا

جھرجھری ایک تن من میں جاگی
تو شعلوں میں لپٹا تصور کا کنج نوا

پھر دوبارہ ابھرنے لگا
شبنمستان دہ ڈوبا ہوا دھند میں
راکھ خواب پریشاں کی اس پر بکھرنے نہ پائی تھی
سبزے پہ اس کے اترنے پایا تھا فردا کا سایہ سیاہ
دور تیزی سے پیچھے سرکتے ہوئے
کھیت میدان جنگل
اندھیرے کے بھاری لحافوں سے نکلے
موذن کی آواز پوری طرح جاگ اٹھی
پہلے بجلی کے کھمبوں پہ روشن ہوئی فجر
تاروں پہ بیٹھے ہوئے طائروں کے
پروں میں چھپی رنگ ریکھائیں
جھلکار اٹھیں

اک ندی پل کے نیچے جو چمکی
تو نام اس کا کیا تھا؟

ثمرا ابوری جان دل!
کچھ شکستہ سے ممتاز

کہیں پرانی سی اک عید گاہ
وہیں ایک لڑکی اُبھر آئی نادان و حیراں
اُٹھائے ہوئے جل بھری ایک گاگر
ہوائے بیاباں کے ریلے میں تلووں سے تھامے زمیں
سنبھالے وہ اڑتا دوپٹہ اب اپنا
کہ لہراتے بالوں کو باندھے غریب
اکیلی ہے جیسے علامت
اسے میں نے آواز دی :
"استقامت !"
تبھی اک ادھورا کرہ نرم تاب
مکمل نمودار خطِ اُفق سے ہوا
اک گھنے کنج نے اس کو دل میں اُتارا
تو جگ مگ کا چشمہ ہُوا دل سے جاری

شبِ رفتہ کی تیز آندھی میں بکھرے
نشیمن کے تنکے
اُٹھاتی رہیں تن بہ تقدیر معصوم چڑیاں

پیروں میں سمائی ہوئی برق

پیروں میں پارہ

اسی پچھلی تھتی کے اطراف

بجتا رہا شور کا جل ترنگ

ہوئی تیز جب رعد کی گڑگڑاہٹ

تو گانے لگے شکر

وہ زمزمہ سنج رنگیں پتنگے

کہ آخر گلی کوچوں کے گندے ملبوں سے ہو کر

یہاں تک تو آیا ہے وقت

کہ ٹکرائے چقماق چقماق سے

اور طغیانِ خوں کے عوض

چاک دل سے اُبل جائے

پورب کا آہنگ

شاید کبھی

جو مدِ مقابل یہیں شانہ بہ شانہ کھڑے تھے کبھی

میرے آنچل کے سائے میں ان کے لئے

پھول خوشیوں کے مہکے
تو ہیں کتنی اونچی اٹھی

بھائی میرے —
سمندر کی تہ کے سیہ پانیوں میں دبی
اک صدا کا حباب
ٹوٹ کر مٹ گیا سطح پر شور پر
دھونکنی نشر گاہوں کی دھونکے چلی جا رہی ہے
خبر پر خبر
سنسنی تہلکہ دھوم دھام
دل میں اک گدگدی سی — شماتت
زباں تک پہنچ کر رہی
ایٹمی بیڑے کی گھن گرج بن گئی

یہ دنیا! یہ دنیا!
اسے تم نہ سمجھے
نہ سمجھو گے آتش بجا لو!
گھنے ابروؤں میں چھپی برق
پیہم چمکتی ہے
بے سمت بے جہت تکتی ہے دیوانہ وار
دیو ہیکل مشینیں فضاؤں میں پر مارتی

خاک پر رینگتی، ہیچ پوچ

آج فولاد پگھلا
بھڑکتے رہے سرخ بھٹی میں
ارماں اسرار جوشِ جنوں

ماَمتا دوُدھ خوں
جانکنی کا ادھورا نشہ جب بھی ٹوٹا
تو پلیسے گیا ہوش و احساس کو بے دریغ
دُور بکھرے دُھوئیں کو نگلتے ہوئے
کھُردرے اور نَم آلود پتھر کا لمس
جذب ہوتا رہا جسم و جاں میں — 'نہیں!'
— 'نہیں' قلب چیخا
زباں، 'ہاں' کا انگارہ بن کر
جہاں جل بجھی
نہیں'! — اور اٹھائے کون و مکاں
خون سے بھر گئے

اُفتادگاہیں نجوم کی

گرتا ہے اندھیرا
دھنواں اگلتی رفتاروں کے بعد
وہیں تاروں کے قریں
منظر بھی کرچ کرچ بکھرے
نظریں بھی کرچ کرچ بکھریں
یوں اپنے آنگن میں اتری
وہ ماہ مئی کی جھَلْ
اپنی کھیتی میں اپجی
دہر کی من مانی

ہم ایسے بے روپ
کہ پھر جو روپ ملا وہ اوڑھ لیا
شام امروز شب رفتہ

ط

صبح فردا

پہناوا بنفشوں کا
اترن بن کر اترا ہوا

پارہ پارہ مٹ میلا
کس چاؤ سے خود کو پہنایا
اک فصل کے بعد کی فصل
پرانا کھاد کا ڈھیر
ہم کھپ گئے جس میں تھا یہ وہی جینا

دن الحمرا ایسے ترشائے مستحکم
سایوں میں پھیلے آہوں میں پگھلے
اب پچھلے قالب کی چاہت میں جان کھپانا
ہو جلتی تعمیم اتنا شرمانا کیا
پی لیتے ہیں تعمیم کو گہرے گہرے خلا
پھر ان کو پاٹ نہیں سکتا کوئی بھی کبھی
تعمیم کو جس چھلنی سے چھانو
سو ہو گی چھنتی رہے سدا

بھٹکے بے چہرہ بے کفِ پا
جیسے سرگرداں معتزلہ
پُر جوشش فطانت سایہ و سبزہ و آب سے عاری پگڈنڈی
کھائی میں مُڑی اور ڈوب گئی
پھر جان نہ پایا کوئی اس پر کیا بیتی

لو سانس بھی آہستہ
یہ شیشہ گری کی کارگہہ نازک افتاد
ہو جائے نہ درہم برہم
ہم ڈرتے تھے
اپنے قدموں کی جنبش سے سہل انگار
اک ذرہ بھی پامال جو ہو
تو نہ جانے کس کا لہو اُبلے
گردشِ فانوس خیال کی تیز ذرا
معمول سے بڑھ کر ہوتی
اور بھگدڑ میلہ میں وہیں مچ جاتی تھی
سب رنگ دھنک کے گڈمڈ
دھنکے ہوئے اُڑتے پھرتے
ایسے میں اکثر چھوٹ گیا

دامن اپنے ہاتھوں سے اپنے اپنے سراپا کا
تب ان کا تختہ الٹ دیا
اس دہر نے جو بن کر جام ایام
گردش کرتا آیا ہے انسانوں میں

سب تیتر ہریل شجر حجر ذرے اجرام
سب جزو کُل ہیں مگن
اور اک ہم
ایک انیک کا گُمتارہ
اس گرد و نواح میں کون آئے گا دوبارہ
سب اڑتی اڑتی اوپری باتیں
اپنی اینٹوں پر اینٹیں
گارے پر گارا رکھتی جائیں
سیمرغ تھکے ہارے
کرتے ہیں کوچ

تمقموں بھرا پھیلاؤ گھنا
اک شہر فصیل کے پار ملا

اک ٹھوس اکائی اپنی اٹوٹ
تانبے کے تاروں سے جڑی
یہ ایک مشین ہے وحدت پرزوں کی
جب تک چاق وچوبند ہیں چلتے ہیں
ورنہ چُھٹی

ہم سر بہ فلک تعمیروں کے معمار
پسنتے ہوئے بے میعاد انھیں کے بوجھ تلے

تب ایک
انھیں کمزوروں میں سے
جو برداشت کی حد سے آگے بڑھ کر
بُوجھ اُٹھاتے نہیں
اک پیچ بنا
جا ٹکرایا
اس ہاتھ سے جو ہتھے پر تھا
خودکار کسی جنبش کا دہ ہاتھ
مامور تھا تیزی سے، حرکت میں آجانے کے لئے
ایسے قدموں کے خلاف
جو چلتے چاک کے ساتھ نہ چل پائیں
تب آناً فاناً وہی قدم لغزش کا شکار
زمیں سے اکھڑا

قرنوں کا
زمانہ طے کرتا
تب جا کے کہیں
پہچان کے جھرنے کی شورش
سنگستاں جاں کی تہہ میں

انساں بھی سُن سکتے
بے گنتی آنکھوں میں
تب پیڑھی پیڑھی
برکھارت کی بستی بس جاتی

چاہے دیر سویر ہو
اور کڑے کوسوں کی دھوپ

ہم نفسِ واحد
آخر کار
آہنگ اک موج کا
سب موجوں کی دھڑکن میں بس جاتا ہے
پھر اُن ہونی کی خمار آلود آنکھوں نے کیسے خواب بنے
اک طالع روشن
آفاق اعلیٰ پر چمک اُٹھا

کیا یہ بھی سفر مبدا ہوگا مطلع ہوگا
ان آنے والے سویروں کا
جو زیرِ نمو ہیں ابھی
آواز قلم کے چلنے کی
دیتی ہے دہائی 'ادب ! ادب' !

یہ راہِ سفر
ہو پائی نہیں طئے
چال سہمے کی چلتے ہوئے
گذری یہ شعب ابی طالب سے
طائف کے
سنگ افشاں باغیچوں کی طرف

جب لہو لہان تھا وقت ایسے عالم میں بھی
آنکھوں میں بسا تھا وہی روشن چہرہ
جگمگا رہے جس کے پرتو سے ہیں غرب و شرق

کتنے دن بعد
ہبوط آدم سے
کتنے دن بعد

آئی تھی وہ رات
بے ریب بدیہی صبح کی نشانیاں
روشن جس میں
اک ذات سراپا چاہت آدم قد سرگرم سفر
منزل بھی اس کی ذات بے ہمتا
وہ تاب نظر معصوم نیاز آگئیں
ہنگام قرب
سرمستِ قیام، قدم انسانی لافانی
جب سے اک فصل ادب کے ساتھ وہاں
تب سے ہی یہ دردِ انا کی
بے میعاد دکھن
اک فصل شہادت کی میعاد بنی
اقصیٰ تا سدرہ شارع عام،
رواں روشن آباد بنی
تب سے ہر باز اشہب نے
پایا اپنے شہپر کا جواز

بہتا پانی

اجلے اجلے تناور تنوں پر تھے نخل زار
منتشر ان میں سیماب گوں نو دمیدہ ہلال اَن گنت
بیکرانی کے شفاف زینوں پہ وہ
فاصلوں کا بھرم بستیاں دُور دُور
آب گوں اک دھندلکے میں لپٹی فضاء خواب گوں
اور نظر کی پہنچ پست و بالا میں بے روک
میں نے کہا
کن کے ناموں سے منسوب ہوں گے
یہ تکئے قدیم
شائبہ سا اک احساس رفتار کا
اپنے ہونے نہ ہونے کا بے سود دھیان
اچانک کہیں اک درندے کا بین

وحشت آلود — بدمزہ بو املتاس کی
تیز جھونکا سا پھرتا اڑان
جھاڑ جھنکاڑ کے درمیاں
پر بچاتا سمٹتا گذرتا ہوا
اک تعاقب کی دہشت
کہ تھم جا
کہیں اوڑھ لے اپنا روپ
ایک ضرب مسلسل
نمودار ہو جا
مگر ہے کہاں جو
نمودار ہو اب
کہ ہم اس سے عادی ہوئے
یہ بھلاوا
پنہ گاہ اخفار کا کوتاہ دامن گڑھا
کتنا پایاب تھا
جب وہ مٹی نم آلود اب تک
وہ افتاد گاہ
علم دار کی
میں نے پہچان لی
کیسے پہچان لی

فجر کا الاؤ

نگاہ سے نہاں الاپتے ہوئے
ہزارہا پرند
الاپ ان کی کوٹتی ہے نُور کے ورق
سُرور کے ورق
الاپ ان کی پوچھتی ہوئی
کہ وہ الاپ
جو بدلتے موسموں کو پیرہن عطا کرے
کہاں ہے ؟
نیند بند کھڑکیوں کے روزنوں سے جھانکتی ہے :
— وہ یہاں نہیں
یہاں نہیں کہ آج اور کل کے درمیاں کا فاصلہ
شمار اس کا
اپنے صَرف کردہ ایندھنوں میں ہو چکا

وہ نادہند
اور نادہند سے تقاضہ کیا ۔

پٹخ پٹخ کے دُور تک
اُچھل رہا ہے
جل رہا ہے فجر کا الاؤ
دُور دُور تک
کُہاسہ ہے پگھل رہا

گُپھا گُپھائیگوں کے دائرے
گُپھا گُپھائیگوں کے دائروں میں
بَن گھنے کہ جن میں جُھٹپٹا
ٹِسویوں کے ساتھ تھا سَدا مُقیم
جل رہے ہیں
جَل رہا ہے فجر کا الاؤ
سُگندھ اس کی اتنی گھائل اتنی تیز ہے
کہ رسیلی رسیلی یہ سُگندھ ہے لہو لہو ـ

سڑک کے کنکروں پہ
چاک گھومتے ہوئے
اداس شمر بوں کے
جاپ سے نہ رُک سکے
دراڑ پڑ گئی تو پھیلتی چلی گئی۔
اِدھر کسی کو وقت کا پہاڑ کاٹنا
اُدھر کسی کو
جنبشِ مژہ سے
گاؤں گاؤں بکھرے مرقدوں کے بیچ
فاصلہ تھا پاٹنا

چراغِ چشمِ نم
کسی بھی شام کے نواح میں جلے
کسی بھی یاد کے
شکستہ طاق میں بھڑک اُٹھے
سدا وہ زیرِ خاک
راہ ڈھونڈتا ہوا چلے
مگر سراغ اُس کو مِل سکے تو صرف اِس قدر

کہ دُور
جہانِ وطن کے مامن کے فاصلوں سے دُور
سطحِ بحر پر
گہر اُچھالتی ہے صُبحِ شاہوار —

یہ قہر جو ہمارے درمیاں روا رکھا گیا
یہ قہر —
کس غضب کا ناگزیر
یہ فصل
جس کے بعد قربِ دل پذیر
اسی کی آڑ سے تو رُونما ہوا
جو از خندہ ہائے بے بہا کسی کے واسطے
کسی کا بھولپن
کہ جس کی کوئی انتہا نہ تھی
وہ میرا اپنا بھولپن ہے
اُدھر وہ نُور نُور رتجگے
دُعائے مُستجاب کے
اِدھر وہ نیند
اُس کی باڑیاں گھنی

چمکتی اوس سے بھری پڑی
دُبیز دُھند اُس کی
شش جہت سے گر رہی ہے

ہر صَواب و ناصَواب
منظرِ کشادہ باب — نیند
میری اپنی نیند
کروٹیں بدل رہی ہے
چشمۂ ازل اُبل رہا ہے
جل رہا ہے فجر کا الاؤ

!!!

والدۂ مرحوم کی یاد میں

نرمل ورما — پانی کی تلاش

وہ مرا وہم
کہ جھونکا سا کوئی سبز قبا تھا
جسے دیکھا
کسی چہکار کی خنکی بھی فضاؤں میں جو بکھرتی
تو یہ کھلتا
کہ ابھی کھوج ہے آغاز ابھی کھوج ہے پرواز
کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہو کھوج یہی
راکھ کی مٹھی میں دبی ادھ جلی پتی

وہی معمول شب و روز
کہ بیداد ہی بیداد ہے

رندا جو لگاتار رہے پھیرتا اپنا
تو بہ ہر زاویہ ہموار
بہ ہر زاویہ چھل چھل کے گوارا
کہیں ہو جائے نہ بے ساختہ فریاد
یہ دھڑکا سا بنا رہتا ہے دل میں !

وہ تنے ٹوٹ رہے ہیں
جو قدم تھے جو بھرم تھے
کہ کوئی لفظ نہ پایا نہ کسی لفظ کا مفہوم
جو پانی کا بدل ہو
وہ تنے جیسا کہ خاموش تہیں خاک کی
خاموش تہیں آنسوئے افلاک کی
لوٹ آئے وہیں
اپنی سسکتی ہوئی بیہودہ حدوں میں
یہی آثار فضاؤں کے کھلے پن سے مزاحم
جو گذرگاہ میں سیلاب کی ہوتے
تو کسی موڑ پہ مڑتے ہوئے
شبنم کا نم و نرم بچھونا انھیں ملتا

تو دو صد ریشہ عناصر وہ گلے بیج
ذرا دیر کو ہو جاتے وہیں ڈھیر مزے میں
کفِ سیلاب میں اُلجھے ہوئے خاشاک میں پوشیدہ
وہ جُھنڈ جُھنڈ کے بہم
چین سے سوتے
کہ ابھی دیر ہے اعلان سحر ہوتے میں
اعلان سحر پہلے سنے جو بھی سحر خیز
وہ اوروں کو بھی جاگ اُٹھنے کا
پیمان فراموش شدہ
یاد دلائے
یہی کلیوں کے تبسم میں گھلی یاد دہانی
جو ٹھہر جائے سماعت
تو سماعت کے لئے ایک انوکھا سا دھماکہ
یہ مرا وہم شگونی مری زنجیر
کوئی اندھکار اُتر آئے جو پایاب گمانوں میں
تو پایاب گمانوں میں
اُتر آتی ہے گہرائی یقیں سی
کوئی سیاح سے سیار سی جھلکار اُتر آئے
جو ٹھہرے ہوئے پانی میں
تو ٹھہرے ہوئے پانی میں

روانی کی مشاہد
مری آشفتہ نگاہی

وہ کہاں پھر بھی مگر لہر تلے لہر کی تعمیر
کہ دے جس پہ جگر تشنہ تمنا بھی گواہی
وہ جو اک سطح گراں مایہ ہے
اک قعر بلا خیز
ابھرتا ہوا ملاح
اترتا ہوا غواص
جہاں وہم نہیں
زندہ و تابندہ حقیقت ہے دل آویز

کوئی ہیرے کی کنی سی کہ ہے طینت میں سرشتہ
کبھی آواز کی لو بن گئی
آفاق بہ آفاق پلٹتی ہوئی اوراق
کبھی چھنتی رہی آنکھوں سے پیہم صفت اشک
تو بدلتا ہوا رستہ
تہہ دریا ہے دہکتی ہوئی بالو میں

نکلتا ہوا رستہ
جیسے دیکھا

وہ مراد ہم نہیں میرا یقیں تھا
کوئی بوٹا جو کھڑا ہے
تو یہی کام ہے اس کا
کہ خزانے کا پتہ پوچھنے والوں کو بتائے
جو خلاؤں کا عقب ہے
وہ خلا کب ہے خلا کب

جو وہاں بھی
ابھی کملی کا کنارا ہو
کسی دور کے امکاں سا جھلکتا
تو وہاں بھی وہی پھیلاؤ چھلکتا ہے چمکتا ہے
سحر رنگ دھندلکے میں
سیہ چشم تجلی کا خنک تاب تلازم

تو جگر سوختگان دو جہاں
کون ہے پھر کھوج میں سرگرم ؟
یہ تم ؟

گھیر کے لائے گئے تم ؟
یا وہ نظر منزلت آرا، نظرِ صاحب کوثرؐ ہے
کہ ہے گشت میں بیدار ؟

جیسے دیکھا
وہ اشارا سا کہ ہاں جوفِ عدم
جوفِ عدم میں بھی جو ممکن ہے
خود آرائی کے عالم میں یہ فیضان کا عالم
تو یہ حیرت کا ٹھکانہ نہیں
ٹوٹے ہوئے آئینو
یہ جڑ جانے کی منزل
یہ جلا پانے کی جا ہے

ٹ

جادۂ رسائی

(نہج البلاغہ)

بڑھتے ہی رہو
گونجا سناٹا
جامد کالکھ چیخ رہی ہے شدر شدر

پیچھے مڑنا پتھرا جانا
اس راہ کا ہر پتھر
راہگیر تھا اپنی ہی مانند
اک دورِ گذشتہ میں
پیچھے نہ مڑو

بڑھتے ہی رہو جیسے بڑھتا ہے کیسا سخت ثمر
بڑھتے بڑھتے اکتاتا نہیں تھک جاتا نہیں
بڑھتے بڑھتے پالیتا ہے اک دن رُت کا
شیریں مدھ ماتا کیف ـــــ کھلا
وہ دروازہ
جو اب تک نامعلوم رہا

اندھکار کی تھاہ میں اک پورب
پلٹا ہوا جب
شاخوں پر رینگتے کیڑے کے
ارمان سے پھوٹ پڑا
تتلی کے پنکھ کھلے دھیرے دھیرے
اُجلی چمکیلی خوش رنگی
لمحے کے قالب سے چھلکی
پھر لامحدود سویرے سے وہ ہم آہنگ اڑان اُس کی

دامان صبا کرنوں کی سرا
تھامے ، ان اُفقوں تک جن کے

آگے در کار نہیں رہتا
دامان صبا کرنوں کا سرا
کوئی بھی وسیلہ بڑھنے کا
بڑھتے ہی رہو

صدہا وہ سہی وہ ہزار سہی
کوفہ کی چٹانیں گنتی ان کی لاحاصل
تب اپنا سایہ اپنا ہم رفتار سہی
چلتے چلتے ان راہوں پر
وہ روپ سجیلا لاثانی
اقلیم غبار کے پار ہوا

جب دن ڈھلنے پر جان پدر!
ہنگامہ بیت چکے
ہوں فولادی سُم روندرہے
بکھرا ہوا رختِ سفر
بازو شہپر مشکیزہ علم

چقماق کے پتھر تیر کمان کتاب قلم
باری آئے نیزوں کی انیوں پر
بڑھنے کی
در بستہ ہر سمت مگر
جنگاہ شام کی سمت کشادہ رہے
آباد یہ جادہ رہے



سلامت سبوچہ ترا ساقیا

ازل بھولا بسرا سا اک خواب ہی
سہی
بند اک باب ہی وہ سدا کے لئے
مگر بارہا
حرف حق لوحِ جاں سے مٹایا گیا جب
بہ انواع جبر
ازل ہی وہ مصرعہ اُٹھانا ابد تک جسے ناگزیر

دھماکے سے پہلے کی اک سنسنی
بنی امتحاں گاہ میں
خوف و دہشت کے ہمدوش اک ذمہ داری کا بار

یہاں ہم نہ ہوتے جو اُمیدوار
تو ہوتے کوئی اور اپنے ہی وہ ہم نشژاد
زمیں آسماں فخر سے، اور غبارِ پس و پیش ہم
دیکھتے ان کو کس رشک سے
سوالات بیباک سے ارتقا کے جُڑے بے شمار
وہ حل کر رہے ہیں
فطانت میں شامل دیانت کے ساتھ

ستاروں کی تقویم کو کس نے دیکھا ہے
لذتِ کشش انتظار
جریدہ میں ثبت اپنے نام
جہاں دیکھ پائیں گے
سطحِ وجود
وہ ہے دُور کتنی
جہاں جا کے عالم تمام
ترا میکدہ ساقیا

ابھی آب و گُل میں گندھی

اور ابھی پردۂ غیب سے جھانکتی یادداشت
بہت اس نے دیکھے طلوع و غروب
بہت پیشہ ور سپرچ کا پھیلا ہوا کاروبار
جرائم کہ جن کے تناور تنتے
یہ فنی مہارت کی اک برتری
اور وہ پاور سُپر
مکافات کی ان کے سر پر جو رُت آ گئی
ستوں در ستوں تھا دھنواں اُگ رہا
ان کے تھالوں کے بیچ

نتیجہ کی فہرست سے نام کتنے
کہ بجتا تھا ڈنکا کبھی جن کا
ہو کر رہے لاپتہ
نہ کوئی دھماکہ نہ کوئی جھماکہ
نہ دنیا دلہن
پکڑ کر جکڑ کر جلائی گئی
قلم کے نوشتہ سے پنپا ہوا خوب زار
وہیں تک رہے سر سبز

لکھو یا قلم نے جہاں تک نہیں اعتبار
مگر پاسبان مفاداتِ صید
قلم نے جہاں لکھ دیا عرفِ صیاد کا
وہیں شاخِ زیتون
گلدانِ آرائشی کا اثاثہ بنی

قلم کو بچا
حرفِ حق کی سزا
بھگتنے کی خاطر سدا
ساقیا
سلامت سبو جہ ترا

٭ ٭ ٭

قدامتِ نمودِ خواب

'فتیلے گل جھڑا بھی دے تمام کا تمام گل'
'فتیلے تھام خود کو تھام'
مگر فتیلہ نیم تیرہ دائرہ
کہ کھوہ کھوہ رینگتا ٹٹولتا رہا سبیل
جہت جہت پسی ہوئی سی راکھ راکھ سہمناک بے تہی
ہر اک پکار اضطرار، اضطرار زیرِ لب کی
ضرب، ضرب رائیگاں
نہ سنگ بستہ جوف کوہ شق نہ دل کو
پیستی

رسولوں کی دار و بست مطلع فلق
تبھی وہ بین ما رو طین حرز جان آدم قدیم ارتسام
جس پہ پو پھٹی

درود
اور درود ہی وہ صخرۂ دوام جس پہ پو پھٹی
مطاف گاہ طائران آشیاں بہ باد خانماں بہ بار
مرجع سلام
صحن قبلہ گاہ
چمکتے لسلساتے سرخ شہپروں کی تازہ کھیپ
پھر انڈیل دی گئی
انڈیل کر بھرا پرادہ دام پھر سبک کمند
پھر سے اک زقند لوٹتی ہوئی ہے بھر رہا
طویل سایہ شاخسار نخل زار سے کٹے ہوئے وہ پنکھ
ڈھیر ان کا اہتزاز پُر خمار لعل رولتا ہوا
مگر شناخت کے نگیں جڑے وہ تاج
سر طراز آفتاب
ستارے
شوخ و شنگ ان میں پُر شباب
بینش و کشش کے سب کہاں گئے؟

ہزار آلہ کہربا صفت روؤں سے لیس مسمرائزر کرہ
فضاء کے وسط سے وہیں جو جھک گیا تو
ناگہاں جھکاؤ کا نہ جانتے مدعا ہے کیا
نکل کے اس سے چھوٹ سی

حیات اور موت کے تلازمے کی چھوٹ
پڑ رہی وہیں ہے اب بھی خاک بیٹھتی
جہاں تراشِ ناخنوں کی

اک ہلال ریزہ بھی
قسم اٹھانے کے لئے بچا نہیں
وہ ذی حیات تاب ریز دھاریاں
بہ کارِ خویش تیز و تند
تماس میں جو ان کے آ گیا وہ چن لیا گیا
عزائمِ شکستہ کی شکستگی سے خستگی سے
چور چور

بساطِ دید اور بھی بسیط اور بھی بسیط
محیطِ یک نفس سرانگاہ کا
الجھ کے تار تار ان ہمالیہ بدوش عمارتوں سے
پے بہ پے اٹھان
جن کی ہے ہنوز اب بھی اٹھ رہی

فرازِ دَر فراز رنگ پاش روپ کار کوچ
پھر رہا ہے خود کو پھیرتا ہوا
ہدف ہدف زلال نرم دھوپ سا
چھلک چھلک کے رچ رہا ہے سلسلے نئے نئے
تو اتر اس کا گونج گونج اک سرور
لاالہٰ لاالہٰ غیر حیِّ لایموت
غیر حیِّ لاینام
وہ لاشریک اپنے کام میں ہمارے کام بھی
جو گوندھنے پہ مائل رضا ہوا
تو گوندھتا چلا گیا وہ بدر کا احد کا کربلا کا
اک سدا بہار سلسلہ
تو رمنہ رمنہ جھلملاتے اشکِ تاب
پالنوں میں خواب آبشار جست
پھولتی شفق کی چوٹیوں کے پار
چل رہے ہیں نعل باجنے کا شور
اٹھ رہا ہے دور
ارغنوں نفس
گھر گھر پسینہ میں پسیجے عنبریں مشام
بڑھ رہے ہیں

گام گام گردنوں پہ سرخیاں گھلا

زر گداختہ

ڈھلک ڈھلک کے لمعہ بار

تو پھر بتاؤ تازہ واردان

اصیل

کس کا دعدہ رِ صہیں

فصیل فیصلہ کے دن کی لانگھنے کو بے قرار

صاحب زمام کے ثبات کا

مثیل کون راہوار

تو پھر بتاؤ تازہ وارداں دردد

ہمہموں بھرا ہے کس کا

زیر ظل عرش زمزموں بھرا

تو پھر بتاؤ انتساب

فتح باب کا قلم ہے لکھ رہا

تو نام کس کا نام جس پہ پو پھٹی

٭٭٭